© rasailojaraid.com

۷۔ حدیث "لا وصیۃ لوارث" کسی بھی طرح قرآنی حکم کو منسوخ نہیں کر سکتی۔

۸۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے آیتِ وصیت کو آیتِ میراث سے اور حدیث لا وصیۃ لوارث سے منسوخ قرار دیا تھا مگر ہم نے انہی کے اسوہ و اسلوب کو اختیار کر کے اس نسخ کو تطبیق دے کر ختم کیا ہے۔ یوں اس ضمن میں فکرِ ولی اللہی کی روشنی میں نئی تحقیق و تطبیق کو پروان چڑھایا ہے۔ اور میں اپنے اس مضمون کو انہی کا فیضان سمجھتا ہوں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص۳۲، اردو ترجمہ رشید احمد انصاری، قدیمی سنز پبلشرز، اردو بازار، لاہور سن اشاعت درج نہیں۔

۲۔ اور ان آیات کو اپنے دس شعروں میں نظم بھی کر دیا ہے۔ الاتقان فی علوم القرآن (اردو) جلد دوم ص۴۹، میر محمد، کتب خانہ مرکز علم و ادب، آرام باغ، کراچی سنہ اشاعت درج نہیں

۳۔ تفسیر منہاج القرآن (سورۃ البقرہ) ص۱۳۹، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت ہشتم، ۲۰۰۲ء

۴۔ ترجمان القرآن، جلد اول ص۳۰۲، شیخ غلام علی اینڈ سنز، پرائیویٹ لمیٹڈ، پبلشرز، لاہور، حیدر آباد، کراچی سنہ اشاعت درج نہیں۔

۵۔ تفسیر نعیمی جلد دوم ص۲۰۷، مکتبہ اسلامیہ، مفتی احمد یار خان روڈ، گجرات سنہ اشاعت درج نہیں۔

۶۔ ایضاً ص۲۱۰

۷۔ ایضاً ص۲۱۰

۸۔ تفسیر ثنائی جلد اول ص۱۲۳، میر محمد، کتب خانہ آرام باغ، کراچی سنہ اشاعت درج نہیں۔

۹۔ حاشیہ محی الدین شیخ زادہ علی تفسیر القاضی البیضاوی، الجزء الاول ص۳۸۸، المکتبۃ الاسلامیہ محمد ازدمیر، دیار بکر ترکیا۔

۱۰۔ المحلی، ابن حزم، مطبوعہ مصر، جلد ۹، ص۳۸۳، (بحوالہ مجموعہ قوانین اسلام، جلد چہارم ص۱۳۶۱۔۱۳۹۲، ڈاکٹر تنزیل الرحمن، ادارہ تحقیقات اسلامی، الجامعۃ الاسلامیہ العالمیہ، اسلام آباد، پاکستان، سنہ اشاعت ۱۹۹۵ء

۱۱۔ تدریس القرآن، جلد اول ص۵۵۱۔۵۵۲، ابو مسعود حسن علوی، اسلامک ریسرچ اکیڈمی، ۳۱۰۔ بلاک ۳، آر کی سروسز پلازہ، ری مال، راولپنڈی، کینٹ، پاکستان، طبع پنجم ۱۹۹۸ء

۱۲۔ تفسیر منسوخ القرآن ص۱۹۹، دوست ایسوسی ایٹس، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

نوٹ۔ یہ بحث ص۱۶۲ تا ص۱۹۹ پر محیط ہے۔

۱۳۔ حاشیہ محی الدین شیخ زادہ علی تفسیر القاضی البیضاوی ص۳۸۸۔

۱۴۔ المفردات فی غریب القرآن ص۱۲۹، نور محمد کارخانہ تجارت، آرام باغ، کراچی سنہ اشاعت درج نہیں۔

اسلام کا مقصد حصول حکومت ہے یا مثالی معاشرہ

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواریؒ

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ قیامِ حکومت اسلام کا کوئی مقصد نہیں بلکہ یہ محض ایک ناگزیر ذریعہ ہے ایک دوسرے بلند مقصد کا۔ اور وہ بلند مقصد ایک مثالی معاشرے کا قیام ہے۔ بحث کو معاشرے تک ہی محدود رکھا گیا ورنہ معاشرہ خود بھی ایک ذریعہ ہے تکمیلِ فرد کا۔ فرد اور معاشرہ ایک دوسرے سے کچھ ایسے پیوستہ ہیں کہ ان کو باہم جدا کرنا مشکل ہے۔ جنت بجائے خود معاشرہ کی مثالی زندگی ہے۔ وہاں کوئی نظامِ حکمرانی اور حاکم و محکوم کا فرق نہ ہوگا۔ مگر معاشرہ ایک خاص انداز کا وہاں بھی ہوگا۔

قرآن کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ بطور نصب العین کے کوئی حکومت قائم کرنا نہیں چاہتا بلکہ اسلام کا مقصد ایک ایسا صالح معاشرہ قائم کرنا ہے جس میں حکومت و سیاست کا دباؤ کم سے کم تر ہوتا چلا جائے۔ یہاں تک کہ حکومت کا وجود معاشرے میں اس طرح تحلیل ہو جائے کہ ہر فرد صرف اپنے اخلاقی تقاضے سے اپنی رضا کارانہ خوشدلی کے ساتھ فرائضِ معاشرہ کو ادا کرتا رہے اور طاعتِ الٰہی میں اس کے اور خدا کے درمیان کوئی واسطہ نہ سیاسی ہو نہ روحانی۔ یعنی نہ ملوکیت ہو نہ پیشوائیت۔

اس حقیقت کو سمجھنے کیلئے کئی سوالات کو پہلے حل کرنا پڑے گا:

۱۔ اس دعوت کا کیا ثبوت ہے کہ قرآن قیامِ حکومت کو طالب نہیں اور وہ صرف نزاعِ معاشرہ چاہتا ہے؟

۲۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی دور میں انسان حکومت کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائے؟

۳۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام کا مقصد کوئی حکومت کرنا نہیں تو اس سے کیا حاصل؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمیں قرآن پاک میں کوئی ایسی آیت نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ اسلام کوئی خاص طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ کسی پیغمبر کی زبان سے کوئی ایسا جملہ نہیں گزرا کہ "میں ایک عمدہ نظامِ حکومت قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یا مجھے خدا نے اسی مقصد کے لئے بھیجا ہے" کے کے تیرہ سال کی نبوی زندگی کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے لیکن ایک موقع بھی ایسا نظر نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آنا جہاں حضور اکرم ﷺ نے یہ فرمایا ہو کہ میرا مقصد کوئی اعلیٰ اور صالح حکومت قائم کرنا ہے۔ حضور کا جو اقتدار کی زندگی میں نیز مدنی زندگی میں بلکہ وفات کے بعد بھی آج تک قائم ہے اس کیلئے حکومت کا لفظ اتنا ہی گھٹیا اور ذلیل ہے جتنا قرآن مجید کے لئے کتاب آئین کا لفظ۔ ذرا آیئے ایک سرسری نظر سے ان دونوں.... پیغمبر ﷺ اور اہل حکومت کے اقتدار کے فرق کا موازنہ کرتے چلیں۔

۱۔ حکومت کا اقتدار بے انتہا تنگ ہوتا ہے۔ اس کا دائرہ اثر ظاہر اور جسم کے خول پر ہوتا ہے اور بھی اسی جگہ جو اس کے علم میں آجائے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک سیاسی دباؤ سے انسان کی زبان چپ رہتی ہے لیکن اس کا دل گالیاں اور بددعائیں دیتا رہتا ہے۔ اس کے دل میں صاحب حکومت کی طرف سے شدید نفرت ہوتی ہے۔ اور دل میں یہ آرزو موجزن ہوتی ہے کہ موقع ملے تو اس کا تختہ الٹ دیا جائے اور شدید قسم کا انتقام لے لیا جائے لیکن پیغمبر کا اقتدار قبضہ اہل ایمان کے جسم پر، روح پر، دل پر دماغ پر، جلوت میں خلوت میں، سوتے، جاگتے حرکت میں، سکون میں، افکار پر گفتار پر، کردار پر غرض ساری زندگی اور زندگی کے تمام گوشوں پر ہوتا ہے۔

۲۔ حکومت سے اگر پولیس اور فوج وغیرہ کو ایک سیکنڈ کے لئے ہٹا یا جائے تو حکومت محض ایک لفظ رہ جاتا ہے جو شرمندۂ معنی نہیں ہوتا لیکن پیغمبری اقتدار ان تمام چیزوں سے بے نیاز اور بالاتر ہوتا ہے۔ یہاں یہ ہوتا ہے کہ مجرم اپنا جرم چھپاتا اور بھاگتا پھرتا ہے اور وہاں کسی سی آئی ڈی اور پولیس کے بغیر مجرم خود آکر سزا و تطہیر پر اصرار کرتا ہے۔

۳۔ وہاں اقتدار کا مظاہرہ دولت و امارات، شان و شوکت وغیرہ سے ہوتا ہے اور یہاں درویشی و فقر، سادگی و قناعت کا لافانی اقتدار ہوتا ہے۔ فتح مکہ کے دن ابوسفیان نے دیکھا کہ حضور ﷺ وضو فرماتے ہیں تو لوگ غسالۂ وضو اپنے چہروں پر ملنے کو ٹوٹے پڑتے ہیں، یہ محبوبیت و شوکت دیکھ کر ابوسفیان نے حضرت عباس سے کہا:

یا ابا الفضل لقد اصبح ملک بن اخیک عظیما ۔ اے عباس تمہارے برادر زادے کا بادشاہانہ اقتدار تو بڑا زبردست ہے۔

عباس نے جواب دیا:

لیس علیک ولکنہا النبوۃ. (ارے بیوقوف) یہ بادشاہت نہیں۔ نبوت ہے (رواہ الطبرانی عن میمونہ)

© rasailojaraid.com

جناب عباس نے ایک ایسی سچی حقیقت بتائی ہے جو ہماری تمام گفتگو کا عطر اور ہمارے سارے دعوے کی جان ہے۔ اس کے بعد کسی تشریح کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ واقعہ یہ ہے کہ محض حکومت خواہ کسی قسم کی ہو اس کی سرحدیں بادشاہت سے زیادہ دور نہیں ہوتیں۔ حکومت خواہ کسی تنہا انسان کی ...ملوکیت یا امریت کی.... شکل میں ہو یا عوام کے نمائندوں کی.... جمہوریت کی.... شکل و صورت رکھتی ہو وہ بہرحال ایک فرد یا چند افراد ہی کی حکومت کا دوسرا نام ہے۔ یعنی ایک طبقہ حاکم اور دوسرا محکوم ہوتا ہے۔ لیکن نبوت کا پیغام اس سے سراسر مختلف ہے۔ نبوت ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتی ہے جس میں نہ کوئی کسی کا محکوم ہو نہ حاکم۔ علامہ اقبالؒ نے اس الٰہی نظام معاشرہ کا نقشہ بڑی خوبی سے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

کس دریں جا سائل و محروم نیست　　عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست
خدمت آمد مقصد علم و ہنر　　کار بارا کس نگی سنجد بہ زر
کس ز دینار و درم آگاہ نیست　　ایں بتاں را در حرم بار اہ نیست

اقبال کا کہنا یہ ہے کہ ہر نظام حکومت میں معاشی نظام یہ ہوتا ہے کہ ایک طبقہ دینے والا اور دوسرا لینے والا، ایک غنی اور دوسرا محتاج ہوتا ہے لیکن الٰہی نظام معاشرہ میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا اور اس معاشی مساوات کے بعد سیاسی حاکیت و محکومیت ہوتی اسی طرح علمی سرمایہ داری کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ چونکہ اس کا نتیجہ بھی آخر وہی اکتناز سیم و زر ہی ہوتا ہے اس لئے یہاں درہم و دینار محض مبادلہ کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ بت بن کر خدائی نہیں کرتا۔ دنیا کی کوئی حکومت ایسی نہیں جو سیم و زر کی خداوندی پر قائم نہ ہو۔ یہ صرف اسلامی نظام معاشرہ ہے جو سب سے پہلے اسی بت کو پاش پاش کرتا ہے۔ اس کے ٹکڑے اڑانے کے بعد پھر اور کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہ سکتی جو اپنی خداوندی قائم کرکے اولاد آدم کو حاکم و محکوم کے دو طبقوں میں بانٹ سکے۔

۴۔ حکومت اور اسلامی نظام معاشرہ میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ وہاں غالب عنصر ہیبت اور دباؤ کا ہوتا ہے اور یہاں محبت، عقیدت، عظمت، خوش دلانہ طاعت اور رضا کارانہ اتباع کا حسین امتزاج ہوتا ہے جو معاشرے کو ایک سدا بہار گلدستہ بنا دیتا ہے۔

۵۔ وہاں قانون و سیاست کی خشکی کو اولیت حاصل ہوتی ہے اور یہاں ساری بنیاد اخلاقی اقدار پر رکھی جاتی ہے۔

۶۔ وہاں مذہب کو اقتدار کا بہانہ بنالیا جاتا ہے اور یہاں اقتدار صرف تقویت دین کے لئے وقف ہوتا

© rasailojaraid.com

ہے۔

۷۔ وہاں اہل حکومت انسانوں کے آقا ہوتے ہیں اور یہاں امیر کی حیثیت بھی ایک خدمت گزار بھائی سے زیادہ نہیں ہوتی (اور یہ امارات بھی خود کوئی مقصود نہیں ہوتی)

۸۔ وہاں انسان کا اقتدار ہوتا ہے اور یہاں انسانی اقدار کا اقتدار ہوتا ہے۔

۹۔ وہاں نری عقل اور سیاست ہے اور یہاں عشق کی پیدا کردہ عقل ہے۔ رومی نے سچ کہا ہے ۔

می شناسد ہر کہ از سر محرم است   زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

۱۰۔ وہاں خالص قاہری ہے اور یہاں دلبری کی راہ سے آنے والی قاہری ہے۔

غرض اسلامی نظام معاشرہ اور انسانی نظام حکومت میں آسمان و زمین کا فرق ہے حکومت جیسی گھٹیا چیز بھی اسلام کا مقصود نہیں بن سکتی۔ اسی لئے نہ قرآن نے اسے اپنا مقصد بنایا نہ کسی رسول نے۔ کسی پیغمبر نے کوئی عمدہ و اعلیٰ نظام حکومت قائم کرنے کی دعوت نہیں دی۔ پیغمبر صرف اپنی اپنی انفرادی و اجتماعی اصلاح حال کی دعوت دیتا ہے۔ کہا حکومت کی عیاریاں اور کہا اسلامی نظام معاشرہ کی ایمانداریاں۔ شتّان بینھما۔ ممکن نہیں کہ کسی فرد یا قوم کا مقصد حکومت ہو اور وہ اس کے لئے ہر ممکن شیطنت و ابلیسیت کو کام میں نہ لائے۔ نظام حکومت کے معنی ہیں انسانوں کو دو طبقوں... حاکم و محکوم... میں منقسم کر دینا اور اس تقسیم کو قائم رکھنے کے لئے اخلاق سے کہیں زیادہ قاہرانہ و جابرانہ دباؤ، سیاسی عیاریوں، ظالمانہ چالبازیوں، ابلیسی سازشوں اور شیطانی فریب کاریوں کو کام میں لانا پڑتا ہے۔ اسکے نزدیک عدل و انصاف، انسانیت، اخلاقی اقدار بے معنی الفاظ ہوتے ہیں۔ ان اوصاف حمیدہ کو اگر حکومت باقی رکھتی ہے تو ان اوصاف کی خاطر نہیں بلکہ صرف اس لئے اور اسی حد تک کہ حکومت کا استحکام قائم رہے۔ اسلام اس طبقاتی تقسیم کو اور اس کی خاطر ان انسانیت کش عیاریوں کو کب روا رکھ سکتا ہے جو حکومت کا لازمی نتیجہ ہیں۔

یہاں ایک زبردست شبہ یہ پیدا ہوگا کہ عملی اسلام کے بہترین دور... عہد نبوت اور عہد خلفائے راشدین... میں بہر حال ایک "انداز حکومت" موجود تھا۔ پس جب خیر القرون میں حکومت سے مفر نہ ہو سکا تو بعد کے کسی دور کے متعلق یہ توقع کب کی جا سکتی ہے کہ وہ حکومت کی ضرورت سے بے نیاز ہو سکے گا؟

یہ سوال بلاشبہ دل میں کھٹک پیدا کر سکتا ہے لیکن اس سے ہمارے اصل دعوے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خیر القرون میں کسی بات کا پایا جانا اور چیز ہے اور اس بات کا مقصود ہونا اور شے ہے۔ خیر القرون میں کئی ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جو بذات خود مقصود نہیں۔ اس وقت ان باتوں کا پایا جانا یقیناً

ناگزیر تھا۔ وہ خیر القرون اس لئے ہے کہ ان حالات میں اس سے بہتر معاشرہ نہ کبھی قائم ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود وہاں کئی چیزیں ایسی موجود تھیں جن کا موجود ہونا ناگزیر تھا لیکن وہ مقصود نہ تھیں۔ ان چیزوں کو اس نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے کہ وہ چیز موجود تھی، ان کو اس نقطۂ نظر سے دیکھئے کہ ان کا رخ کس مقصد کی طرف مڑا ہوا تھا۔ آیا وہ چیزیں اس لئے اختیار کی گئی تھیں کہ وہ بذات خود مقصود تھیں یا اس لئے کہ عبوری طور پر انہیں اختیار کرنا ناگزیر تھا اور مقصود کچھ اور تھا؟ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے چند مثالوں پر غور کیجئے جو ہم کئی موقع پر پیش کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ قرآن نے کئی جگہ لونڈی غلام کے متعلق احکام دیے ہیں۔ لیکن ان کا مقصد غلامی کی توثیق نہیں بلکہ ایسا نظام معاشرہ تعمیر کرنا ہے جس میں غلامی کی رسم ہی ختم ہو جائے اور تمام انسان یکساں آزادی کی سانس لیں۔

۲۔ قرآن نے محتاجوں اور سائلوں کی اعانت پر بار بار ابھارا ہے لیکن اس کی غرض یہ نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ بھیک مانگنے والوں کا ایک طبقہ ضرور موجود رہے تاکہ ان کی امداد کا ثواب لوٹا جایا کرے۔ بلکہ اس سے غرض ایسا معاشی نظام بنانا ہے جس سے محتاجی دور ہو جائے اور کوئی کسی کا دست نگر نہ رہے۔

نے بہ بازاراں زبیکاراں خروش   نے صداہائے گدایاں در دو گوش

کس نہ باشد در جہاں محتاج کس   نکتۂ شرع مبین این است و بس (اقبال)

۳۔ قرآن نے متعدد جرائم کے لئے سزائیں بتائی ہیں لیکن ان کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ وہ جرم ہوتے رہیں تاکہ سزائیں دے دے کر قرآنی حکم پورا ہوتا رہے بلکہ اسکا اصلی مقصود یہ ہے کہ معاشرے سے جرائم کا خاتمہ ہو جائے اور تعزیر و حدود کا قانون معطل ہو جائے۔

۴۔ قرآن بار بار قتال و جنگ پر ابھارتا ہے لیکن اس کا اصلی مقصد اس کے بالکل برعکس ہے یعنی آخرکار وہ ایسا نظام امن قائم کرنا چاہتا ہے کہ جنگ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔

اندراں عالم نہ لشکر نے قشون   نے کسے روزی خورد از کشت و خون

۵۔ قرآن نے طلاق کے متعلق بھی احکام دیے ہیں لیکن ان سے مقصود طلاقوں کو رواج دینا نہیں بلکہ اسے ختم کرنا ہے۔

۶۔ قرآن نے وراثت کے بھی احکام دیے ہیں لیکن اس سے مقصد جاگیرداری کی توثیق یا بقا نہیں بلکہ اسے دوسری تیسری پشت میں تدریجاً اس طرح ختم کر دینا ہے کہ آخر میں ضرورت بھر رہ جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ قرآن کے بہت سے احکام ایسے ہیں جو اپنے اصلی مقصد کے ہم شکل نہیں بلکہ گویا نقیض ہیں اور علاج بالضد کی طرح ناگزیر علتیں ہیں جو اگرچہ مجبوراً اختیار کرنی پڑتی ہیں لیکن خود مقصود نہیں ہوتیں۔

اس کے بعد یہ بات بھی آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ قرآن نے اگرچہ امیر و مامور کے متعلق بھی احکام دیے ہیں اور خیر القرون میں بھی نظام امارت موجود تھا۔ لیکن منتہائے مقصود کسی سیاسی و قانونی استبداد کا نظام حکومت قائم کرنا نہیں بلکہ وہ اس راہ سے ایک ایسا "لاریاست" صالح معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم۔ بلکہ ہر شخص اتنی بلندی پر پہنچ جائے کہ کسی روحانی و سیاسی (پیشوائی و حکومتی) واسطے کے بغیر براہ راست طاعت الٰہی کرتا رہے۔ یہ تجربہ ہر روز ہمارے گھروں میں بھی ہوتا رہتا ہے۔ ہم بچوں پر اپنی حکومت ہی قائم کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے کام جن کے فلسفے کو بچہ نہیں سمجھ سکتا اسے ڈانٹ ڈپٹ کر، دھمکیاں دے کر، دباؤ ڈال کر، کرا لیتے ہیں۔ لیکن یہ جبر و اکراہ محض عارضی، وقتی اور عبوری ہوتا ہے، ہمیشہ قائم رہنے کے لئے نہیں۔ اسے اس راہ سے ایک ایسے مقام پر لیجانا مقصود ہوتا ہے۔ جہاں اس میں سمجھ آجائے اور وہ اپنے فرائض کسی دباؤ کے بغیر ہی ادا کرنے لگے۔ بالکل یہی شکل معاشرے کی ہوتی ہے۔ معاشرے سے جو کام بھی حکومتی دباؤ ڈال کر لیا جاتا ہے وہ ایک عبوری اور ناگزیر ذریعہ ہوتا ہے۔ اس حکومتی دباؤ کو کوئی دائمی مقصد سمجھ لینا صحیح نہیں۔ اس ناگزیر دباؤ کے ذریعے کاروان انسانیت کو ایک ایسی منزل پر لیجانا مقصود ہے جہاں یہ دباؤ ختم ہو جائے۔ بلاشبہ یہ منزل دور ہے۔ بہت دور۔ مگر مقصد اور نصب العین یہی ہونا چاہیے۔

یہیں سے دوسرے سوال کا جواب شروع ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا کبھی انسان پر ایسا دور آنا بھی ممکن ہے کہ وہ حکومت سے بے نیاز ہو جائے؟ بلکہ تیسرے سوال کا جواب بھی اسی میں آجاتا ہے جو یہ ہے کہ یہ تسلیم کرنے سے کہ اسلام کا مقصد حکومت نہیں کون سا فائدہ ہے؟

بات یہ ہے کہ مثالی معاشرہ ایک نصب العین ہے۔ نصب العین نام ہی ہے اس حقیقت کا جو کبھی حاصل نہ ہو، یا افق کی طرح ہمیشہ نظر کے سامنے آگے آگے رہتا ہے۔ اور اسے ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ فطرت ارتقاء پذیر ہے۔ ساری کائنات میں ارتقا جاری ہے۔ ہر شے ایک نصب العین کی طرف بے ساختہ بڑھتی اور کھنچتی چلی جارہی ہے اسے کسی مقام پر ٹھہراؤ نہیں۔ اگر نصب العین حاصل ہو جائے تو وہیں ٹھہراؤ پیدا ہو جائے گا۔ اور ارتقاء ختم ہو جائے گا۔ قدرت نے اس کائنات کا

نظام ہی کچھ ایسا بنایا ہے کہ نصب العین تو حاصل نہیں ہوا کرتا مگر نصب العین متعین کئے بغیر کام بھی نہیں چل سکتا۔ گویا نصب العین یہ رہ جاتا ہے کہ ایک ایسے نصب العین کی طرف بڑھتے چلے جاؤ جو کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ غالب نے اس حقیقت کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے کہ:

گفتمش: ذرہ بخورشید رسد؟ گفت: محال

گفتمش: کوشش من طلبش؟ گفت: رواست

ذرہ خورشید تک پہنچ تو نہیں سکتا لیکن اس کا کام یہی ہے کہ خورشید تک پہنچنے کی کوشش میں اپنی زندگی ختم کر دے۔ رومی نے اسے دوسرے انداز سے یوں ادا کیا ہے۔

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما

گفت آں کہ یافت می نشود، آنم آرزوست

تم کہتے ہو کہ مقصود حاصل نہیں ہوتا اور میرا مقصود ہی وہ ہے جو حاصل نہ ہو سکے سقراط نے کہا ہے کہ "نقطے کا وجود محض ذہنی ہے۔ خارج میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جا سکتی جس پر نقطے کی تعریف صادق آسکے یعنی اس میں نہ طول ہو نہ عرض ہو نہ عمق ہو لیکن جب تک نقطے کو تسلیم نہ کیا جائے اس وقت تک خارج میں کوئی اقلیدسی کام چل ہی نہیں سکتا" جس کا طول (بلا عرض و عمق) "خط" ہے اور خط کا صرف متعین کنارہ (بلا طول و عرض و عمق) نقطہ ہے۔ یعنی نقطے کا حصول ممکن ہی نہیں لیکن اسے مانے بغیر نہ خط بنتا ہے نہ سطح، نہ اقلیدسی شکلیں اور نہ جسم یہی صورت نصب العین ہے کہ اسے مقصد بنانا پڑے گا۔ جس کا حصول تو ممکن نہیں۔ لیکن اس کے بغیر کوئی جد و جہد ہی ناممکن ہے۔ سب سے بڑا اور اصل نصب العین خدا ہے۔ اس کا عرفان ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ جیسے بندۂ خدا کو بھی یہی کہنا پڑا کہ:

ما عرفناک حق معرفتک — جیسا عرفان چاہیے تھا وہ مجھے بھی حاصل نہ ہو سکا۔

پس جس مثالی معاشرے کا ذکر اوپر ہوا ہے۔۔۔۔ جس میں حکومت کا کوئی وجود نہ ہے۔۔۔ وہ بے شک ممکن الحصول نہ ہو لیکن نصب العین وہی رہے گا (آئیڈیل وہی معاشرہ ہے جو پوری طرح حاصل نہ ہو سکے لیکن نگاہ اسی پر جمی رہے اور ارتقاء اسی کی طرف ہوتا رہے۔ اگر ایسا معاشرہ حاصل ہو جائے تو ارتقاء وہیں ختم ہو جائے گا اور جو چیز ارتقاء کو ختم کر دے وہ نصب العین نہیں بن سکتی۔ زندگی کا بڑا مقصد جنت کا حصول ہے لیکن ایسا قرار وہاں بھی نہیں جو ارتقاء کو ختم کر سکے۔ وہاں کی زندگی کے متعلق بھی قرآنی ارشاد یہی ہے کہ:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لهم درجات عند ربهم　　　　درجات کا لا انتہائی ارتقاء وہاں بھی ہے۔

پس یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ "انسان پر کوئی ایسا دور بھی آسکتا ہے جب اسے حکومت کی ضرورت نہ رہے؟ ایسا دور آئے یا نہ آئے لیکن نصب العین یہی رہے گا اور اسی بلند مقصد کی طرف معاشری نظام کا رخ رکھا جائے گا۔ نصب العین اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ حاصل کیا جائے بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ اس کے حصول کی کوشش میں ساری قوتیں صرف کی جاتی رہیں۔ نصب العین حاصل تو نہیں ہوتا لیکن اس کا قرب زیادہ سے زیادہ حاصل ہوتا ہے اور اس سے ملتی جلتی نعمت اور اس سے ہم رنگی کی دولت حاصل ہو جاتی ہے جسے ہم تقرب یا تخلق کہہ سکتے ہیں۔ پھر اس تقرب اور تخلق میں بھی لا انتہا درجات ہیں۔ ہر تقرب کے آگے ایک اور تقرب اور تخلق کے بعد ایک اور بلند تر تخلق کا مقام ہے بس اسی طرح ارتقاء کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ غرض نصب العین قیام حکومت نہیں بلکہ اختتام حکومت ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آج تک ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں حکومت کا وجود رہا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ اس کے باوجود ہمارا دعویٰ اپنی جگہ قائم ہے شر کا وجود بھی ہمیشہ رہا ہے اور انسان کبھی اس سے بے تعلق نہیں رہ سکا بلکہ اس کا وجود اتنا ضروری ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو خیر کا عرفان بلکہ وجود بھی ناممکن ہے۔ لیکن بہر حال نصب العین خیر ہی رہے گا۔ وجود شر ضروری ہونے کے باوجود کبھی مقصد نہیں بن سکتا۔ دنیا میں کفر بھی ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ رہے گا اور اس کے بغیر اسلام کی شناخت ناممکن ہے۔ اس کے باوجود مقصد اسلام ہی ہوگا۔ اسی طرح حکومت کا وجود بھی ایک شر ہے ...ناگزیر شر ...اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ لیکن اس کے باوجود یہ مقصد نہیں یہ تو صرف ایک ایسا شر ہے جو کسی بڑے شر کو دور کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔

یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس کے بغیر کوئی کام نہیں چلتا۔ کام تو روپے کے بغیر بھی نہیں چل سکتا لیکن کون دعوے کر سکتا ہے کہ روپیہ کوئی نصب العین یا مقصد ہے۔ روپے سے زکوٰۃ دی جاتی ہے، حج کیا جاتا ہے، مساجد تعمیر کی جاتی ہیں، جہاد کیا جاتا ہے۔ کون سی نیکی ہے جو روپے سے نہیں ہوتی؟ اس کے باوجود روپیہ کوئی مقصد نہیں۔ اور اگر یہی مقصد بن جائے تو اس سے بڑا دنیا میں کوئی شر نہیں۔ قرآن اس کی مذمت سے بھرا پڑا ہے۔

اس کے بعد تیسرے سوال کو لیجئے کہ اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام کا مقصد قیام حکومت نہیں تو اس سے فائدہ کیا ہے؟ فائدہ صرف یہ ہے کہ ایک نصب العین سے انسان کا زاویہ نظر ہی

بدل جاتا ہے اور اس سے پوری زندگی اور پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے زندگی اور معاشرے کا سارا نظام زاویۂ نگاہ ہی کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ اگر انسان جنگ کو مقصد بنا لے تو ہر حیلے بہانے سے جنگ چھیڑا کرے گا اور اگر مقصد جنگ کو ختم کر کے ایسا نظام امن قائم کرنا ہو جس میں جنگ کا نام ونشان ہی مٹ جائے تو اس زاویہ نظر کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ:

۱۔ انسان جنگ کو جہاں تک ٹال سکتا ہے ٹالے گا۔

۲۔ صرف وہیں جنگ کرے گا جہاں یہ ہر لحاظ سے ناگزیر ہو۔

۳۔ اتنی ہی جنگ کرے گا جتنی ضروری ہو۔

۴۔ حاکم ومحکوم کی خلیج برائے نام رہ جائے گی۔

۵۔ مساوات انسانی کا دور دورہ ہوگا۔

۶۔ حکومتی انداز صرف وہیں استعمال ہوگا جہاں کوئی اور چارہ کار ہی موجود نہ ہو۔

۷۔ حکومت کے اظہار کی ضرورت کم سے کم ہوگی۔

۸۔ ہر حرکت وسکون کا رخ اس طرح ہوگا کہ ایک طرف حکومت کا انداز رفتہ رفتہ ختم کیا جائے اور دوسری جانب اسی تناسب سے اخلاقی اقدار کو ترقی دی جائے تاکہ ایک دن حکومت کا وجود اور اس کی ضرورت ختم ہو جائے اور ساری طاعت الٰہی کسی قانونی وسیاسی دباؤ کے بغیر رضا کارانہ خوش دلی کے اندرونی جذبے سے ہونے لگے۔

ایک بڑا مغالطہ یہ ہوتا ہے کہ آنحضرت اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کے ادوار کو ایک نظام حکومت تسلیم کرنے کے بعد گفتگو کی جاتی ہے۔ اس دعوے کی دلیل مشکل ہے کہ حضور ﷺ نے کوئی حکومت قائم فرمائی تھی یا صحابہ کرام نے قیام حکومت کو اسلام کا مقصد سمجھا تھا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا مقصد ایک اعلیٰ اور صالح نظام معاشرہ تھا۔ حکومت کا تھوڑا سا انداز ایک مجبوری اسے اختیار کیا گیا جو ناگزیر تھا اور چونکہ قیام حکومت مقصد نہ تھا اس لئے ان سب کا رخ اسی طرف تھا کہ حکومت کو تدریجاً ختم کر دیا جائے اور معاشرے کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا جائے جہاں حکومت بے معنی اور بے ضرورت ہو کر رہ جائے۔ انہیں حکومت کا اگر کسی مجبوری سے استعمال ناگزیر نظر آیا تو آٹے میں نمک کے برابر یا اس سے بھی کم استعمال کیا۔ اور وہ بھی صرف اس وجہ سے ہوا کہ اصلاح معاشرہ کا کوئی خاص خلا اس کے بغیر پر نہ ہو سکتا تھا۔ ان کا اصل رجحان اور زاویہ نظر قیام حکومت نہ تھا بلکہ اسے مٹانا تھا اور ان کی سیرتیں اس پر بہترین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گواہ ہیں۔ ان کے نظام امارات کو دیکھ کر یہ سمجھنا کہ یہ کوئی حکومت تھی یا یہی ان کا مقصود تھا ایسا ہی ہے جیسے ان کی کنیزوں اور غلاموں کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ وہ اس ادارہ غلامی کو مقصود سمجھ کر باقی رکھنا چاہتے تھے۔ یا ان کی تعزیرات کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ جرائم کو جاری رکھنا چاہتے تھے تاکہ قرآنی تعزیرات و حدود کی تکمیل ہوتی رہے...... خلفائے راشدین کی یہ ساری باتیں عبوری تھیں۔ مجبورانہ وقتی ضرورت کی تکمیل تھی۔ مقصود ان میں سے کوئی بات نہ تھی۔ پس حکومت بھی ایک ایسی ہی چیز ہے جو نہ اسلام کا مقصود ہے نہ ان کا مقصود۔ اسلام درحقیقت ایک نزاصالح نظام معاشرہ چاہتا ہے اور حکومت کو محض ایک عبوری اور وقتی ضرورت کی تکمیل کے لئے کم سے کم استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ بلاشبہ یہ منزل ابھی بہت دور ہے۔ لیکن نصب العینی حقیقت یہی ہے۔ اس منزل کی دوری کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ اہل اسلام نے اسے ایک مقصد بنا لیا ہے۔ وہ جب تک اسے مقصد بنائے رہیں گے منزل مقصود سے دور تر ہوتے چلے جائیں گے اور (جیسا کہ ہم ساری دنیا میں عموماً اور مسلمانی ممالک میں خصوصاً دیکھ رہے ہیں)، اقتدار و حکومت کی جنگ اور کرسیوں کی لڑائی ہر روز شدید سے شدید تر اور پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی جائے گی۔ ان کی ساری قوتیں اور انرجی اسی میں ضائع ہوتی رہے گی اور معاشرے کی کوئی اصلاح نہ ہوگی۔ حکومتوں کے دباؤ سے کبھی کوئی بہتر معاشرہ نہیں بنا ہے، کبھی اخلاقی قدریں نہیں قائم ہوئی ہیں۔ کبھی روحانی تزکیہ نہیں ہوا ہے۔ یہ تمام کام ان لوگوں نے کئے ہیں جو حکومت کو لعنت سمجھتے رہے ہیں حکومت کا اقتدار اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرسکتا کہ چند بدمعاشوں کو وقتی طور پر علانیہ ظاہر ہونے سے روک دے لیکن اصلاح و تزکیہ کا کام حکومتوں سے کبھی نہیں ہوا۔ مکی زندگی میں جو افراد اسلام کو ملے ویسے افراد سیاسی اقتدار حاصل ہونے کے بعد کہاں میسر ہوئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم محض قوم کی خدمت و اصلاح کے لئے حکومت یا وزارت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ بات بڑی معصومانہ ہے لیکن یہ سب درحقیقت ہوس اقتدار کا شیطانی جذبہ ہے جو معصومیت کا غلاف اوڑھ کر زبان پر آتا ہے گویا وزارت و حکومت کے بغیر قوم کی کوئی خدمت ہی نہیں ہوسکتی۔ آپ خود ہی سوچئے کہ جس شخص نے اپنے بے اقتداری کے دور میں کبھی کسی پیاسے کو اٹھ کر ایک گلاس پانی نہ پلایا ہو، کبھی کسی غریب کو بازار سے سودا لاکر نہ دیا ہو، کبھی کسی ضعیف کا بوجھا پنے کاندھوں پر نہ اٹھایا ہو..... اس سے یہ توقع کب ہوسکتی ہے کہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھتے ہی ابوبکرؓ اور عمرؓ کی طرح خدمت گذار قوم بن جائے گا۔ اگر دنیا کی تاریخ میں اس کی ایک آدھ استثنائی مثال مل سکتی ہے تو ہزار استقرائی

نظیریں اس کی ملیں گی کہ بے اقتداری کے اولیاء حصول اقتدار کے بعد شیطان بن گئے۔

اولیاء اور انبیاء میں سب ہی حکومت سے بھاگتے رہے ہیں بلکہ ملتی ہوئی حکومت کو ٹھکراتے رہے ہیں۔ سیدنا موسیٰ لاولد فرعون کے واحد متبنّٰی تھے۔ ذرا انتظار فرما لیتے تو فرعون کے بعد تخت حکومت کے تنہا وارث ہوتے۔ لیکن حکومت ملنے کا انتظار نہ فرمایا بلکہ بنی اسرائیل کو لے کر جنگل جنگل مارے پھرے اور حکومت کے ذریعے ان کی تربیت کرنے کے بجائے غربت میں انہیں تربیت دیتے رہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ یوسف و سلیمان علیہم السلام کی نظیریں ہمیں ملتی ہیں جن کے ہاتھ میں خدا نے حکومت کی باگ ڈور دے دی لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حصول حکومت ان کا کوئی مقصود بھی تھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مسیح و یحییٰ السلام نے بے زوج زندگی بسر کی لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ نبوی طریقۂ زندگی میں بے زوج زندگی بسر کرنا بھی داخل ہے۔ نبوت کی آئیڈیل زندگی جس طرح ازدواجی زندگی گزارنا ہے اسی طرح نظام حکومت سے دور رہنا بھی ہے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں چند احادیث نبوی بھی نقل کردیں۔ ان سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ حکومت کوئی مقصد نہیں۔ یہ ایک ناگزیر علت ہے جہاں تک ممکن ہو اس سے بچنا ہی مناسب ہے اور اس کی تمنا یا اسے مقصد بنانا غارت گر انسانیت ہے، ملاحظہ ہو:

(۱) یا عبدالرحمان لا تسأل الامارة فانک ان اوتیتها عن مسألة وکلت الیها وان اعطیتها من غیر مسألة اعنت علیها (رواہ الستۃ الا مالکا عن عبدالرحمان بن سمرہ)

اے عبدالرحمٰن! کبھی امارت کی طلب نہ کرو کیونکہ اگر تمہیں مانگ کر امارات ملی تو نفس کے پھندوں میں آجاؤ گے اور اگر بے طلب مل جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری امداد ہوگی۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اور اس کے عہدے سے جہاں تک ممکن ہو گریز ہی کرنا چاہئے اور کبھی دل میں اس کی تمنا یا طلب نہ کرنی چاہئے۔ اگر حکومت کوئی اہل (پوری سطر پڑھنے کے قابل نہیں ہے صفحہ نمبر ۱۳۲) درخواست کی۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ:

(۲) انا واللہ لا نولی هذا العمل احدا سأله او احدا حرص علیه. (رواہ الشیخان وابوداؤد و نسائی)

ہم کسی ایسے شخص کو اس عہدے پر مامور نہ کریں گے جو اس کی طلب یا تمنا رکھتا ہو۔

ظاہر ہے کہ حکومت مطلوب و مقصود بننے کی چیز ہوتی تو اس کی تمنا یا طلب کو مذموم نہ قرار دیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتا۔

(۳)انکم ستحرصون علی الامارۃ و ستکون ندامۃ یوم القیمۃ فنعمت المرضعۃ وبئست الفاطمۃ (رواہ البخاری والنسائی عن ابی ہریرہ)

تم لوگوں میں عنقریب امارت کی حرص پیدا ہونے لگے گی۔ لیکن بروز حشر سبب ندامت بنے گی یہ دودھ پلاتے وقت تو بڑی اچھی ہوتی ہے لیکن دودھ چھڑاتے وقت بڑی بری ہوتی ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جس چیز کی تمنا حشر میں باعث ندامت وشرمندگی ہو وہ مقصود نہیں ہو سکتی۔

(۴)ان النبی ﷺ ضرب علی منکبیہ(یعنی المقدام بن معد یکرب)ثم قال افلحت یا قدیم ان مت ولم تکم امیرا ولا کاتبا ولا عریفا۔

آں حضرت ﷺ نے مقدام بن معد یکرب کے کاندھوں پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمایا کہ اے قدیم! اگر کہیں کے امیر یا منشی (سیکرٹری) یا چودھری بنے بغیر ہی مرجاؤ تو سمجھ لو کہ تم نے فلاح حاصل کرلی۔

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی حکومت بھی مقصود نہیں ورنہ اس کے عدم حصول ہونے پر فلاح کی بشارت نہ دی جاتی۔

(۵)من سال القضاء وکل الیٰ نفسہ و من جبر علیہ ینزل علیہ ملک یسددہ(رواہ ابو داؤد والترمذی عن انس)

جو شخص عہدہ قضا کو مانگ کر حاصل کرے گا وہ اپنے نفس کے داؤ میں آئے گا اور جسے مجبور کر کے یہ عہدہ سپرد کیا جائے گا اس پر ایک فرشتہ نازل کیا جائے گا جو اسے ٹھیک راہ پر لگاتا رہے گا۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حکومت یا اس کا عہدہ مقصود بننے کے قابل نہیں ورنہ اس کی طلب وتمنا پر تہدید کیوں ہوتی؟

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ احادیث یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ حکومت چھوٹی ہو یا بڑی مطلوب ومقصود نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف ایک مجبورانہ طریق کار ہے لہٰذا جہاں تک ممکن ہو اس سے گریز ہی کرنا چاہئے۔ اور اگر یہ چیز خود بخود مجبورانہ حالت میں حاصل ہو جائے تو اس کا انداز یہ ہونا چاہئے کہ ناگزیر حالات میں اصلاح معاشرہ کا کام لینے کے لئے کوئی خلا پر کر دیا جائے اور پھر بھی زاویہ نظر یہ ہو کہ

معاشرے کی اخلاقی قوت کو بلند سے بلند تر کر دیا جائے۔ اور اسی نسبت سے حکومت کا وجود کمزور کیا جاتا رہے تا آنکہ ایک دن حکومت کا وجود ہی ختم کر دیا جائے۔

حکومت کی صحیح پوزیشن یہ ہے کہ وہ ایک ایسی مکروہ شے ہے (اگر عادلانہ وصالح ہو) ورنہ ایسی حرام چیز ہے (اگر غیر عادلانہ ہو) جو صرف اضطراری کیفیت میں جائز ہو جاتی ہے۔ لب جان بھوکا اگر کوئی مکروہ یا حرام چیز اپنی جان بچانے کی غرض سے کھالے تو جائز ہے لیکن پھر بھی یہ شرط ہے کہ اس میں چاہت ورغبت نہ ہو کہ مزے لے لے کر کھائے بلکہ اندر سے طبیعت میں تنفر ہونا ضروری ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نہ استعمال کی جائے کہ جان تو بچ سکتی ہو چھٹانک بھر میں اور کھالی جائے ڈیڑھ پاؤ۔ ان دو شرطوں کے ساتھ جسے قرآن غیر باغ ولا عاد کہتا ہے، حرام شے کا استعمال بھی حالت اضطرار میں روا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ نادان کون ہوگا جو اس مجبورانہ جواز کا یہ مطلب سمجھے کہ یہ استعمال حرام بھی کوئی مقصد زندگی ہے؟

حکومت کا وجود اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ وہ معاشرے کی اخلاقی زندگی میں ایک اضطراری ضرورت پوری کرنے کا عارضی ذریعہ ہے اوپر جتنی احادیث پیش کی گئی ہیں وہ اسی کی غمازی کرتی ہیں کہ حکومت کوئی ایسی مستحسن چیز نہیں جس کی تمنا یا کوشش کی جائے خواہ کتنے ہی معصوم جذبے سے حکومت کی خواہش وسعی کی جائے لیکن ہوس اقتدار کی آمیزش اس میں ضرور ہوگی اور جاہ ومال کی آرزو ایک شیطانی جذبہ ہے جس کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

ماذئبان ضاریان فی حضیرۃ یاکلون ویفسل ان با ضر فیھا من حب الشرف وحب المال فی دین المرء المسلم رواہ البزار عن بن عمر۔

دو خونخوار بھیڑیوں کا کسی زخم کو چاٹ چاٹ کر خراب کرنا زخم کے لئے اتنا مضر نہیں جتنا مضر ایک مسلمان کے دین کے لئے حب جاہ ومال ہے۔

پس اسلامی نقطۂ نظر سے حکومت اور اس کے جاہ واقتدار کو مقصد بنانا درست نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر ناگزیر طور پر اسے اختیار کرنا ہی پڑے تو طبیعت میں اندر سے وہی جذبہ نفرت وحسرت ہونا چاہئے جو اضطرار میں حرام اشیاء کے استعمال سے ہونا ضروری ہے اور پھر اس کا استعمال اتنا کم ہونا چاہئے جس سے وہ اضطرار رفع ہو جائے۔ گویا غیر باغ ولا عاد کی شرط پوری کرنی ضروری ہے۔ پھر اسے ایک مجبورانہ حالت کا عارضی وعبوری مداوا ہی سمجھنا چاہئے نہ کہ مقصد۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ صحیح ہے کہ اقتدار وحکومت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے روپے کے بغیر کام نہیں چلتا۔ اپنی اور دوسروں کی ضروریات رفع کرنے کے لئے جتنا روپیہ (جائز طریقے سے) حاصل کیا جائے درست ہے لیکن اگر روپیہ ہی مقصود بن جائے تو اس سے جتنا بڑا دینی نقصان پیدا ہوگا اس کے ذکر سے اسلام کا سارا لٹریچر بھرا پڑا ہے۔ حکومت کو لوگ خاص اپنا مقصد قرار دیں تو ایک بات بھی ہے لیکن حکومت کو اسلام کا مقصد قرار دینا تو کسی طرح صحیح نہیں۔

مسلمانوں نے جب اسلام، قرآن، دین اللہ، رسول ﷺ وغیرہ کو رسی واسطہ بنا کر حکومت کو مقصد قرار دے دیا تو رفتہ رفتہ تمام فرعونیت اندر گھس گئی۔ پھر یہ ہوا کہ اسلام تو نکل گیا اور صرف حکومت رہ گئی۔ اس کے بعد دین ومذہب کے نام پر حصول اقتدار کے لئے جو خانہ جنگیاں ہوئیں وہ مسلمانوں کی تاریخ کا بہت ہی افسوس ناک باب ہے۔ اب آپ اپنے ملک پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک کو بغور دیکھئے۔ ہر اکھاڑ پچھاڑ، ہر جوتم بیزار، ہر جوڑ توڑ اور ہر جنگ وجدل میں صرف ایک ہی چیز کارفرما نظر آئے گی اور وہ ہے ہوس اقتدار وحکومت۔ اس تمام سر پھٹول میں جو قیمتی وقت، توانائی اور روپیہ برباد ہوتا ہے۔ اگر اسکا دسواں حصہ بھی تعمیری کاموں میں صرف ہو تو یقین کیجئے امت کے بیشمار مسائل حل ہو جائیں اور معاشرہ درست ہو جائے لیکن مقصد تو بن گیا ہے حصول حکومت واقتدار، اور اسی کو اسلام کا مقصد قرار دیدیا گیا ہے اس لئے اصل مقصد تو پیچھے رہ گیا بلکہ تقریباً آٹے میں نمک کے برابر رہ گیا۔ (حقیقت صرف اتنی ہے کہ دین سے قوت حاصل ہوتی ہے لیکن سمجھا یہ گیا ہے، کہ قوت سے دین حاصل ہوتا ہے) جس دین کا مقصد قوت واقتدار ہو اس کا حشر یہی ہوتا ہے کہ دین کی راہ سے آنے والی قوت اسی دین کو فنا کر دیتی ہے۔ لیکن اگر مقصود صرف دین ہو جو اصلاح معاشرہ کا دوسرا نام ہے تو حکومت ثانوی اور ناگزیر علت کی حیثیت سے آ جائے جب بھی اور نہ آئے جب بھی دین اپنا کام کرتا رہتا ہے۔

افتاء کونسل کا قیام

پچھلے دنوں جامعہ اسلامیہ کورے وال کے مہتمم علامہ محمد اعظم سعیدی نے پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج کو اپنے ادارہ کی افتاء کونسل کا صدر مقرر کیا ہے۔ جبکہ دیگر علماء کے ساتھ ڈاکٹر محمد عارف خان ساقی، اس کونسل کے ممبر ہیں۔ دینی رہنمائی کے لئے افتاء کونسل سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ رابطہ کیلئے:

مجلس التفسیر کا پوسٹل ایڈریس اور ای میل دونوں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

قریش مکہ .... عالم میں انتخاب

ڈاکٹر محمد عارف خان ساقی

استاذ عربی زبان وادب

شعبہ 'علوم اسلامیہ، جامعہ' کراچی

اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ورسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت خاندان قریش سے ہوئی۔ قریش مکہ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بڑے فرزند حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ بعثت سے قبل پورے جزیرہ نمائے عرب پر قریش مکہ کا اپنا ایک مخصوص وضع کا مذہبی وسیاسی اور کسی حد تک ریاستی اقتدار قائم تھا۔ یہ نظام مذہبی وسیاسی اقتدار کا ایک ملغوبہ تھا۔ اس کے اثرات لوگوں کے طور طریقوں، رہن سہن، طرز زندگی اور جملہ دیگر شعبہ ہائے حیات شخصی واجتماعی پر حاوی وطاری تھے۔ قریش کو اہل اللہ کے عظیم الشان خطاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس طرح چونکہ ان کا احترام ایک مذہبی اور اعتقادی نوعیت کی روایت اور معاملہ تھا اس لئے عرب، اپنی مرضی، آزادی اور خوش دلی سے قریش مکہ کا بے پناہ احترام کیا کرتے تھے۔ اس معاملے میں کسی پر بھی کسی طرح کا کوئی دباؤ، جبر یا اکراہ کی کوئی صورت موجود تھی نہ ہی ممکن۔ قریش مکہ کو یہ مقام ومرتبہ خانہ 'کعبہ کی ولایت کے باعث حاصل ہوا تھا۔ سطور ذیل میں کسی قدر وضاحت کے ساتھ عالم عربی کی نگاہ میں قریش مکہ کے مقام ومرتبہ پر روشنی ڈالی جائے گی۔ تاکہ یہ پہلو پوری طرح سے نمایاں اور واضح ہو کر سامنے آ سکے کہ آخری بعثت کے لئے قبیلہ 'قریش کے انتخاب کی وجہ بادی النظر میں کیا سمجھ آتی ہے۔

قریش کا پیشوایانہ کردار

قریش مکہ عالم عربی کے لئے پیشوا کا درجہ رکھتے تھے۔ پورے جزیرہ نمائے عرب میں سب سے زیادہ عزت ووقار قریش مکہ کو ہی حاصل تھا۔ کسی اور قبیلہ کو اس کے ہم پلہ ہونے یا اس سے ہمسری کا کوئی دعویٰ نہ تھا۔ اگر کسی کے دماغ میں کبھی یہ سودا سمایا بھی ہوگا تو محض لاحاصل اور ناقابل اعتناء ہی رہا ہوگا۔ ذرا زیادہ واضح لفظوں میں قریش مکہ شرف وبزرگی کے معاملے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پورے عرب میں لاثانی اور ایک اجارہ دار قبیلہ سمجھا اور مانا جاتا تھا۔ جرجی زیدان کی حسب ذیل رائے اس ضمن میں بہت معتدل و متوازن ہے اور اپنے اندر حقیقت کا وزن رکھتی ہے۔ لکھتے ہیں :

''عرب کے قبائل میں قریش کے گھرانے کا رتبہ ایسا تھا جیسا بنی اسرائیل میں ''لاویوں'' کا مرتبہ تھا۔ انہیں بھی وہی امتیازات حاصل تھے جو ان کو اپنی قوم میں تھے۔ یہ اختیارات و مراتب عیسائیوں کے یہاں کے کاہنوں کے مراتب سے ملتے جلتے تھے۔ وہ سب پر حکمران تھے اور ان پر حاکم بالادست کوئی شخص نہ تھا۔''(۱)

یہ امتیاز ان کو اس وجہ سے حاصل ہوا کہ خانہ ٔ کعبہ کے متولی تھے۔ اور تولیت کعبہ کے حقدار یوں ہوئے کہ بنی اسماعیل تھے۔ مگر آخر آخر میں نظر آنے والا یہ رتبہ تو کیا، تاریخ کے ادوار میں ذرا پیچھے چلے جائیں تو بنی اسماعیل کا تذکرہ بھی کم کم ہی ملتا ہے۔ رفعت و منزلت کا یہ عظیم انقلاب ۴۴۰ء میں آ کر برپا ہوا۔ اب تک اپنی جمعیت میں قوت و تحکم اور غلبہ و اقتدار سے محروم ہی چلے آئے تھے۔ بس روحانی معاملات میں کسی قدر ان کو بھی شریک مشورہ کر لیا جاتا تھا۔ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں فرزندوں، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام کی اولاد میں نبوت و رسالت مقدر تھی۔ بنی اسحاق میں تو زمانوں نبوتیں اور رسالتیں آتی رہیں۔ اس حوالے سے ادھر بنی اسماعیل اپنی وحدت و شناخت سمیت نسبتاً گوشہ ٔ گمنامی میں گم رہے۔ کئی کئی پشتوں کے بعد کوئی ایک یا دو نامور بزرگ ملتے ہیں۔ جنہوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسبت اور یاد کو از سر نو زندہ اور تازہ کر دیا۔ مثلاً عدنان اور معد بن عدنان۔ مگر پھر وہی کنج قفس اور گوشہ ٔ گمنامی۔ اس طرح زمانوں بعد آپ علیہ السلام کی اولاد میں سے کسی کے شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے اور پھر سے دب جانے میں بھی قدرت کی یہ حکمت و مصلحت کارفرما نظر آتی ہے کہ بنی اسماعیل اپنی اصل شناخت سے محروم ہو کر کہیں اپنے نسب و نسبت کے معاملے میں کسی ابہام کا شکار نہ ہو جائیں۔ چونکہ آخری بعثت، یعنی نبی موعود کی آمد، انہی میں سے ہونا مقدر تھی۔ یہ بار امانت ابھی ان کی اس جداگانہ اور ممتاز حیثیت اور شناخت کے سر ہی تھا کہ وہی حقیقی ''بنی اسماعیل'' ہیں۔ لہٰذا اس امتیازی شناخت کا نبی موعود کی بعثت سے قبل مٹ جانا منشائے الٰہی میں ہی نہ تھا۔

قریش اپنے باہمی اختلافات اور عہدوں کی مختلف ہاتھوں میں تقسیم کے باعث خاصے کمزور ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی کوئی بڑی تبدیلی لانے کے قابل وہ نہ رہے جیسی تبدیلیاں

عمرو بن لحی اور قصی بن کلاب کے ہاتھوں ہوتی ہوئی ہمیں نظر آتی ہیں۔ دراصل ان دونوں کے ہاتھوں میں ساری قوت مجتمع اور مرتکز ہو کر رہ گئی تھی۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ عہد جاہلی کے اعتقاد کی رو سے صحیح معنوں میں یہی دونوں عربوں کے طاقتور ترین ''احکم الحاکمین'' ہوئے ہیں۔ ان دو میں سے بھی اول الذکر زیادہ خودسر، طاقتور اور دینی اقدار سے بیگانہ تھا۔ چنانچہ اتنی بڑی تبدیلی لانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کے زیر اثر عربوں نے اپنے جد امجد حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دیئے ہوئے دین و پیغام توحید کو چھوڑ کر شرک و بت پرستی کی راہ کو اختیار کر لیا۔ مگر خانہ کعبہ کی اپنی مرکزیت اور اس کی ولایت کے باعث قریش کی اب بھی بڑی شان باقی تھی اور ان کو عزت و احترام کی نظر سے ہی دیکھا جاتا تھا۔ بلکہ بڑی حد تک اب بھی یہ عربوں میں احکم الحاکمین ہی کا درجہ رکھتے تھے۔ زہیر بن ابی سلمیٰ مری کے الفاظ میں اس کے وقتوں تک قریش کی عظمت و شوکت کا عالم یہ تھا۔ کہتا ہے :

متی یشتجر قوم تقل سرواتهم	هم بیننا فهم رضا و هم عدل
هم جددوا احکام کل مضلة	من العقم لا یلفی لامثالها فصل
بعزمة مامور مطیع و امر	مطاع فلا یلفی لحزمهم مثلُ
ولست بلاق بالحجاز مجاورا	ولا سفرا الا له منهم حبلُ
بلاد بها عزوا معد و غیرها	مشاربها عذب و اعلامها ثملُ
هم خیر حی من معد علمتهم	لهم نائل فی قومهم و لهم فضلُ(۲)

☆ جب کسی قوم میں اختلافات پھوٹ پڑتے ہیں تو ان کی سربرآوردہ شخصیات ایک ہی بات کرتی ہیں، وہ لوگ یعنی قریش، ہمارے درمیان حَکم ہیں۔ ان پر سب راضی و خوش ہیں اور وہی عادل بھی ہیں۔

☆ انہوں نے ہر گمراہ کن اور ہلاکت آفریں جنگ کے احکام کی تجدید کر کے انہیں از سر نو مرتب کر دیا ہے، ان کے جیسا فیصلہ زمانے میں کہیں نہیں ملتا،

☆ ایسے واجب حق کے تحت جو مامور اور راسخ ہے، اور آمر بھی ہے اور مطاع بھی، اور ان کے حزم و احتیاط کی کہیں مثال نہیں ملتی،

☆ اور میں حجاز کے اندر جوار کعبہ میں اگر سکونت رکھنا چاہتا ہوں یا اس علاقے میں سفر ہی کرنا چاہوں تو ہر کہیں ان کے معاہدات کا جال پھیلا ہوا ہے جس کا مجھے سامنا ہوگا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

☆ یہ ایسے علاقے ہیں کہ بنو معد وغیرہ یہاں پوری طرح سربلند و مقتدر ہیں، ان کے چشمے تو میٹھے ہیں ہی، ان کے پہاڑ بھی اقامت گاہیں ہیں،

☆ بنو معد میں یہ لوگ (قریش مکہ) سب سے اچھے قبیلے کے لوگ ہیں، میں انہیں جانتا ہوں، اپنی قوم کے یہ مانے ہوئے سردار ہیں اور بزرگی و برتری ان کو اس طور حاصل ہے کہ ان کی بات حتمی اور حرف آخر ہوتی ہے۔

تاریخی پس منظر

کعبہ معظمہ کی ولایت صدیوں بنی خزاعہ کے ہاتھوں میں رہنے کے بعد یعمر بن عوف الشداخ کے فیصلے کے تحت قصی کو ملی تھی۔ مکہ کی امارت بھی اسی کو ملی۔ ساتھ ہی سیاسی و روحانی اور سماجی پیشوائی واقتدار دونوں قصی اور قبیلۂ قریش کو مل گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شرف و بزرگی اور تقدس و حرمت کا تاج پورے عالم عربی نے خزاعہ کی جگہ قصی اور قبیلۂ قریش کے سر پہ سجا دیا اور پھر کسی جانب سے کوئی مزاحمتی یا مخالفانہ آواز تک نہ ابھری۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی پس منظر میں اس اجمال کی تفصیل اس طور کی جائے کہ عالم عربی کی نگاہ میں قریش مکہ کے سماجی مقام و مرتبہ کی بہتر انداز سے وضاحت ہو سکے۔ اس تفصیل کے چیدہ چیدہ نکات حسب ذیل ہیں:

بنائے کعبہ کے بعد حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام اس کے اولین متولی ہوئے۔ چونکہ آپ علیہ السلام ہی اس کے بانی بھی تھے اس لئے کسی کے لئے اس امر میں حارج ہونے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ توریت کے بیان کے مطابق آپ علیہ السلام کی عمر ایک سو سینتیس (۱۳۷) برس ہوئی۔ (۳)

اللہ تعالیٰ نے ذریت ابراہیمی میں برکت کا وعدہ فرمایا تھا۔ آپ علیہ السلام کے بڑے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاں بارہ نامور بیٹوں کی ولادت کی بشارت ملی تھی۔ چنانچہ توراۃ نے ان بارہ فرزندوں کے نام بھی گنوائے ہیں۔ (۴)

آپ علیہ السلام کی اولاد میں نابت اور قیدار بہت مشہور اور نامور ہوئے ہیں۔ کعبہ معظمہ کی ولایت آپ علیہ السلام کے بعد نابت کو منتقل ہوئی۔ پھر ان سے، ایک روایت کے مطابق ان کے ماموں اور دوسری روایت کے تحت ان کے نانا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سسر مضاض بن عمرو جرہمی نے زمام کار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس طرح کعبہ معظمہ کی ولایت اور مکہ

مکرمہ کی امارت بنو اسماعیل کے بجائے بنو جرہم کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔ مسعودی کا بیان ہے:

لما قبض اسماعیل قام بالبیت بعده نابت بن اسماعیل، ثم قام من بعده اناس من جرهم لغلبة جرهم علی ولد اسماعیل. و کان ملک جرهم یومئذ الحارث بن مضاض وهو اول من ولی البیت. (۵)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا جب انتقال ہو گیا تو آپ علیہ السلام کے بعد آپ علیہ السلام کے بیٹے نابت، بیت اللہ شریف کے نگران اور والی ہو گئے۔ پھر ان کے بعد بنو اسماعیل پر چونکہ بنو جرہم کو عددی لحاظ سے برتری حاصل تھی اس لئے بیت اللہ شریف کی نگرانی کے فرائض انہی میں کے کچھ لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ ان دنوں بنو جرہم کا رئیس حارث بن مضاض تھا، اس لئے یہی شخص پہلے پہل کعبہ معظمہ کا والی بنا۔

ابن ہشام کی روایت بھی اسی قول کی تائید کرتی ہے۔ بجز اس کے حارث بن مضاض جو کہ رشتے میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بچوں کے ماموں ہوتے ہیں، کی بجائے آپ علیہ السلام کے سسر مضاض بن عمرو جرہمی کو اولین متولی بتایا ہے۔ ان کا بیان حسب ذیل ہے:

عن محمد بن اسحاق، قال: لما توفي اسماعیل بن ابراهیم ولی البیت بعده ابنه نابت بن اسماعیل ما شاء الله ان یلیه ثم ولی البیت بعده مضاض بن عمرو الجرهمی. (۶)

محمد بن اسحاق سے روایت ہے۔ کہتے ہیں: جب اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کا انتقال ہو گیا تو آپ علیہ السلام کے بعد آپ کے فرزند نابت بن اسماعیل، جب تک قدرت نے ان کو موقع دیے رکھا، خانہ کعبہ کے متولی رہے۔ پھر ان کے بعد مضاض بن عمرو جرہمی خانۂ کعبہ کے متولی ہو گئے۔

گزرتے وقت کے ساتھ بنو اسماعیل کی آبادی میں اس قدر اضافہ ہوتا گیا کہ مکہ مکرمہ کی سرزمین ان پر تنگ ہونے لگی۔ لہٰذا قریبی علاقوں کی طرف نقل مکانی شروع ہو گئی۔ اور ہوتے ہوتے بنی اسماعیل پورے جزیرہ نما کی وسعتوں میں پھیل گئے۔ ابن ہشام کا بیان ہے:

نشر الله ولد اسماعیل بمکة و اخوالهم من جرهم ولاة البیت والحکام بمکة لا ینازعهم ولد اسماعیل في ذلک لخئولتهم و قرابتهم و اعظاما للحرمة ان یکون بها بغی او قتال فلما ضاقت مکة علی ولد اسماعیل، انتشروا في البلاد. فلایناوون قوما الااظهرهم الله علیهم بدینهم فوطئوهم ثم ان جرهما بغوا بمکة و استحلوا خلالا من الحرمة فظلموا من دخلها من غیر اهلها و اکلوا مال الکعبة الذی یهدی لها، فرق امرهم فلما رات بنو بکر بن عبد مناة بن کنانة و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غسان من خزاعة ذلک اجتمعوا لحربهم و اخراجهم من مکة فاذنوهم بالحرب فاقتتلوا فغلبتهم بنو بکر و غسان. فنفوهم من مکة و کانت مکة فی الجاهلیة لا تقر فیها ظلما و لا بغیا و لا یبغی فیها احد الا اخرجته (۷)

اللہ تعالیٰ نے بنو اسماعیل کو مکہ مکرمہ میں خوب فروغ بخشا۔ اس اثناء میں ان کے ننھیالی بنو جرہم بیت اللہ کے والی اور مکہ مکرمہ کے حاکم بنے رہے۔ بنو اسماعیل ننھیالی رشتے کے احترام میں اور اس مقام پر بغاوت و سرکشی اور قتل و غارتگری کو نہایت نامناسب خیال کرتے ہوئے ان سے کسی طرح کا نزاع و تعرض نہ کرتے تھے۔ جب مکہ مکرمہ میں نسل اسماعیلی زیادہ بڑھی تو وہ لوگ مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ وہ جدھر کا بھی رخ کرتے اللہ تعالیٰ دین کی برکت سے ان کو غالب کرتا اور باقی قومیں مغلوب ہو جاتیں۔ پھر مرور ایام کے ساتھ یہ ہوا کہ بنو جرہم کے دماغوں میں سرکشی کا سودا سما گیا۔ خانہ کعبہ کی حرمت کو پامال کرنے لگ گئے۔ باہر سے آنے والوں پر ظلم روا کر لیا۔ خانہ کعبہ کے لئے جو عطیات آتے وہ بھی کھانے اڑانے لگے تو ان کا شیرازہ بکھر گیا۔ جب بنو بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ اور بنو خزاعہ کے غبشان نے یہ صورتحال دیکھی تو انہوں نے بنو جرہم سے جنگ کرنے اور ان کو مکہ مکرمہ سے نکال باہر کرنے کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ انہوں نے ان کو جنگ کے لئے للکار دیا۔ خوب رن پڑا۔ بنو بکر اور غبشان غالب آ گئے اور انہوں نے مکہ مکرمہ سے بنو جرہم کا صفایا کر دیا۔ عہد جاہلیت میں بھی مکہ مکرمہ کی شان یہ رہی ہے کہ ظلم و سرکشی کو یہاں کبھی پناہ و ٹھکانہ نہیں ملا۔ اور جب کبھی بھی کسی کے دماغ میں سرکشی کا سودا سمایا اس مقدس شہر نے اسے نکال باہر کر دیا۔

موقع کی مناسبت سے یہاں اس بات کی جانب اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بنو جرہم نے مکہ مکرمہ چھوڑتے وقت زمزم کا کنواں پاٹ دیا تھا اور اس میں کئی تاریخی چیزیں دفن کر کے اس کے نشانات بھی مٹا دیئے تھے۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عمرو بن حارث بن مضاض جرہمی نے خانہ کعبہ کے دونوں ہرن اور اس کے کونے میں لگا ہوا پتھر (حجر اسود) نکال کر زمزم کے کنویں میں دفن کر دیا اور اپنے قبیلہ بنو جرہم کو ساتھ لے کر یمن چلا گیا (۸)

بنو جرہم کو مکہ مکرمہ سے بیدخلی اور وہاں کی حکومت سے محروم ہونے پر بڑا قلق ہوا۔ چنانچہ علامہ حموی نے بنو جرہم کے آخری متولی، جن کا نام اولین متولی کے نام سے ملتا جلتا ہے، عمرو بن الحارث بن عمرو بن مضاض الاصغر کے حسب ذیل دکھ بھرے اشعار نقل کئے ہیں:

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا — انیس و لم یسمر بمکة سامر

بلی نحن کنا اهلها فابادنا — صروف اللیالی و الجدود العواثر (۹)

☆ لگتا ہے مقام حجون سے لے کر مقام صفا تک ہمارا کوئی آشنا تھا ہی نہیں، اور نہ کبھی کسی قصہ گو نے مکہ کی شبانہ محفلوں میں قصہ گوئی ہی کی ہے۔

☆ ہاں! کیوں نہیں، یقیناً ہم ہی اس کے باشندے تھے لیکن زمانے کی گردشوں اور ٹوٹی ہوئی قسمتوں نے ہمیں اجاڑ پھینکا۔

جدید محققین کی تحقیقات کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کا زمانہ تقریباً دو ہزار برس قبل مسیح ہے۔ اس حساب سے مکہ مکرمہ میں قبیلہ جرہم کا وجود کوئی دو ہزار ایک سو برس تک رہا۔ اور ان کی حکمرانی لگ بھگ دو ہزار برس تک رہی۔ (۱۰)

جبکہ بنو خزاعہ کی حکمرانی اور ولایت کعبہ کی مدت علامہ یاقوت حموی نے حسب ذیل بیان کی ہے:

ثم ولیت خزاعة البیت ثلاثمائة سنة یتوارثون ذلک کابرا عن کابر حتی کان اخرهم حلیل بن حبشیه بن سلول (۱۱)

پھر بیت اللہ شریف کی ولایت بنی خزاعہ کے ہاتھوں میں چلی گئی جو تین سو برس تک قائم رہی۔ بڑے بیٹے کا بڑا بیٹا وارث ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آخر الامر میں حلیل بن حبشیہ بن سلول متولی ہوا۔

صاحب مروج الذہب، مسعودی کے بیان سے بھی اسی امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ (۱۲)

یعمر بن عوف الشداخ کا فیصلہ

بنو خزاعہ میں سے آخری والی کعبہ معظمہ، حلیل بن حبشیہ کے عہد میں آ کر حالات نے ایک اور بڑا پلٹا کھایا۔ یہی وہ وقت ہے جب بنی اسماعیل کے معروف قبیلے قریش میں سے قصی بن کلاب کا ظہور ہوا۔ قصی نے حلیل بن حبشیہ کی بیٹی حبی سے نکاح کر لیا جس سے اس کے چار بیٹے ہوئے۔ پھر قصی کی قوت و شوکت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ ادھر بنو خزاعہ کا اقتدار بھی مائل بہ زوال اور قریب الغروب ہوتا گیا۔

پھر ایک حج کے موقع پر قصی نے بنی صوفہ سے منیٰ کی جانب روانگی کا پروانہ دینے کا منصب یہ کہہ کر چھین لیا کہ بنی اسماعیل اس منصب کے زیادہ اہل اور حقدار ہیں۔ (۱۳)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روایت کے مطابق خزاعہ اور بنو بکر نے یہ دیکھا تو انہیں قصی سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ قصی نے ان کو بھی للکار دیا اور اپنی پوری جمعیت ان کے مقابلے پر لا کھڑی کی۔ ادھر بنو خزاعہ بھی اپنے حامیوں اور حلیفوں کو لے کر میدان میں اتر آئے اور جنگ کی ٹھان لی۔ جنگ ہوئی اور گھمسان کا رن پڑا۔ جب فریقین کا بڑے پیمانے پر جانی نقصان ہو چکا تو جنگ بندی کا داعیہ پیدا ہوا۔ دونوں فریق اس امر پر رضا مند ہو گئے کہ فریقین کے درمیان جھگڑا چکانے کے لئے کسی عرب کو "حَکَم" مقرر کیا جائے گا اور جو بھی فیصلہ وہ کرے گا، فریقین اس کے آگے سرِ تسلیم و جبینِ نیاز خم کر دیں گے۔ مشہور مؤرخ علامہ طبری کا بیان ہے:

ثم انهم تداعوا الى الصلح الى أن يحكموا بينهم رجلا من العرب فيما اختلفوا فيه ليقضي بينهم ، فحكموا يعمر بن عوف .... فقضیٰ بينهم بأن قصيا أولى بالكعبة و أمر مكة من خزاعة و أن كل دم أصابه قصي من خزاعة و بني بكر موضوع يشدخه تحت قدميه و أن ما أصابت خزاعة و بنو بكر من قريش و بني كنانة و قضاعة ففيه دية مؤداة و أن يخلى بين قصي و بين الكعبة و مكة . فسمي يعمر بن عوف يومئذ الشداخ لما شدخ من الدماء و وضع منها . فولي قصي أمر مكة . (۱۴)

پھر دونوں فریق اس شرط پر جنگ بندی پر آمادہ ہوئے کہ باہمی جھگڑا چکانے اور پر امن تصفیہ کے لئے عربوں میں سے ہی کسی کو "حَکَم" مقرر کریں گے تاکہ وہ ان کے درمیان باعثِ نزاع و مختلف فیہ معاملے کا فیصلہ کر دے۔ اس کے بعد ہی انہوں نے یعمر بن عوف کو حَکَم مقرر کیا۔ اس نے فیصلہ دیا کہ

(۱) قصی، کعبہ کی ولایت اور مکہ کی امارت کا خزاعہ کے مقابلے میں زیادہ حقدار ہے،

(۲) قصی نے خزاعہ اور بنو بکر کا جو خون بہایا اسے وہ باطل قرار دیتے ہوئے اپنے پاؤں کے نیچے روندھتا ہے،

(۳) خزاعہ اور بنو بکر نے قریش اور بنو کنانہ و بنو قضاعہ کا جو خون بہایا اس کی دیت لازم ہے، اور یہ کہ

(۴) قصی بن کلاب اور کعبہ و مکہ کے درمیان حائل ہر رکاوٹ دور کر دی جائے۔

اسی فیصلے کے باعث یعمر بن عوف کو اسی دن سے شداخ (۱۵) کہا جانے لگا۔ اس

کی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے خزاعہ اور ان کے حلیفوں کے خون رائیگاں قرار دے دیئے تھے۔ اس طرح قصی کو بیت اللہ کی ولایت اور مکہ مکرمہ کی امارت حاصل ہو گئی۔

قصی اپنے دور کے مردِ آہن ثابت ہوئے۔ ولایت و امارت کے حصول کے بعد ان کی عظمت و شوکت میں لازوال اضافہ ہوا۔ یہ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا کہ بنی اسماعیل کی شیرازہ بندی کر کے ان کی بکھری ہوئی قوت کو یکجا کیا۔ ان کی اصل حیثیت اور عظمت کو ایک نئی زندگی دے دی۔ اور صدیوں کی محرومی اور مایوسی کے اندھیروں سے ان کو نکال کر ایک قابلِ رشک اور ناقابلِ تسخیر مقام و مرتبہ کا ان کو وارث بنا دیا۔ کعبۂ معظمہ کی ولایت اور مکہ مکرمہ کی امارت کا ان کا چھنا ہوا اور غصب شدہ حق واپس لے کر بنی اسماعیل کے مذہبی و روحانی اقتدار کو بھی پھر سے پوری طرح بحال کر دیا۔ منصور پوری لکھتے ہیں:

قصی نے جو عدنان دوم سے پندرہویں پشت میں ہے، پھر مکہ پر قبضہ حاصل کر لیا اور اس نے مکہ میں مشترکہ حکومت کی بنیاد ۴۴۰ء میں رکھی۔ (۱۶)

اس اقدام سے عالمِ عربی میں قریشِ مکہ کو وہ عزت و عظمت اور تفوق برتری حاصل ہو گئی کہ عہد جاہلی کے شعراء ان کے قصیدے گاتے تھے۔ قریش کو چونکہ ایک واضح فیصلے کے باعث حقِ ولایت ملا تھا اس لئے ان کو حَکَم کے اس فیصلے کی قانونی اور اخلاقی پشت پناہی کے باعث پچھلے والیانِ کعبہ کے دونوں خاندانوں کے مقابلے میں زیادہ مستحکم اور مضبوط پوزیشن حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ ان کا آلِ اسماعیل ہونا ایک ایسی ڈھال بن گیا تھا کہ جس نے ان سے ولایتِ کعبہ کا منصب چھینے یا ہتھیا لینے کے بارے میں سوچنا بھی کسی کے لئے ممکن نہ چھوڑا تھا۔ یہی کچھ وجوہات تھیں کہ زہیر بن ابی سلمیٰ مری ان کی شان و شوکت اور عظمت و رفعت کا حسبِ ذیل الفاظ میں نقشہ پیش کرتا نظر آتا ہے:

سعیٰ بعدهم قوم لكي يدركوهم　　فلم يفعلوا ولم يليموا و لم يألوا
فما يك من خير أتوه فانما　　توارثه آباءُ آبائهم قبل (۱۷)

☆ان (قریش) کے پیچھے ایک اور قوم نے بھی کوشش کی کہ ان کے شرف و بزرگی کے مقام تک پہنچ جائے مگر وہ ایسا نہ کر سکے، اور چونکہ ناممکن تھا اس لئے ملامت زدہ بھی نہ ہوئے کہ انہوں نے اپنی طرف سے تو کسی طرح کی کوئی کوتاہی نہیں کی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

☆ تو جو کچھ بھی بھلائی کے کام ان سے صادر ہوتے ہیں وہ سب دراصل ان کے آباء و اجداد کی قائم کردہ روایت ہی کا تسلسل ہیں۔

عالم عربی میں قریش مکہ کا احترام الگ تھا اور انہوں نے جزیرہ نما کے دور دراز علاقوں کے مقامی سرداروں سے امن و امان قائم رکھنے اور تجارتی کاروانوں کو محفوظ راہداری دینے کے لئے حلف الگ لے رکھے تھے۔ اس کے علاوہ ایلاف کے نام سے قریبی ممالک سے تجارتی راہداری کے لئے امن معاہدات کر لینے کے بعد قریش نے شام، حبشہ، یمن اور عراق کی جانب تجارتی کاروان روانہ کئے۔ عرب قبائل کے انہی احلاف اور دیگر ممالک سے تجارتی امن معاہدات کا ذکر کرتے ہوئے مطرود الخزاعی کہتا ہے:

یا یھا الرجل المحول رحلہ ھلا نزلت بآل عبد مناف
الآخذین العھد من آفاقھا و الراحلین برحلۃ الایلاف [18]

☆ اے شخص جس کی سواری کا رخ پھیر دیا گیا، تو عبد مناف کی ال کے ہاں کیوں نہ گیا،

☆ وہی جنہوں نے ہمارے سرداروں کے ساتھ معاہدے کر رکھے ہیں اور وہی جو تجارتی امن معاہدوں کے تحت سفر کرتے ہیں۔

ان امور سے یہ چیز تو واضح ہو جاتی ہے کہ قریش کی بقیہ عالم عرب پر فوقیت اور بالادستی ایک مسلمہ حقیقت تھی۔ اور آپ ﷺ کا خاندان قریش میں سے ہونا آپ ﷺ کو باقی عالم عربی سے نمایاں کرتا اور ایک ممتاز مقام کا حامل ظاہر کرتا ہے۔ البتہ خود قریش کے اندر بھی رقابتوں اور خلفشار کا ایک زہرناک عنصر موجود تھا۔ لہٰذا ان کی اندرونی دیرینہ رقابتوں اور حریفانہ کشمکش کے پیدا کار عوامل پر بھی یہاں ایک نگاہ مناسب ہوگی۔

مناصب بیت اللہ کی تقسیم پر مبنی فیصلہ

اپنی عمر کے آخری حصے میں پہنچ کر قصی نے اپنے فرزند عبدالدار کو اپنا جانشین بنایا اور اپنی پوری قوت و شوکت مجتمع حالت میں اس کے سپرد کر دی۔ قصی کی ہدایت کے مطابق عبدالدار کو ولایت کعبہ کا شرف تو مل گیا مگر اس کے بھائی اس صورت حال سے زیادہ خوش نہ تھے۔ مرور ایام کے ساتھ ساتھ یہ دوریاں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ حتیٰ کہ ایک روز ایسا آیا کہ چچازاد ایک دوسرے کے خلاف تلواریں سونت کر میدان میں نکل آئے۔ اور بیت اللہ شریف سے متعلق مناصب کی ازسرنو تقسیم کی خاطر بنی عبد مناف اور

بنی عبدالدار کے مابین حَکَم کے تقرر کی ضرورت پیش آ گئی۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ بنی عبد مناف کی سیادت ان دنوں عبد شمس بن عبد مناف کر رہے تھے جو ان سب میں سب سے زیادہ سن رسیدہ شخص تھے۔ دوسری طرف بنی عبدالدار کے معاملات عامر بن ہاشم کے ہاتھ میں تھے۔[19]

قریش کے باقی قبائل بھی فریقین کے ساتھ ہی تقسیم ہو گئے تھے۔ کچھ کا خیال تھا کہ بنی عبد مناف امور تولیت کو سنبھالنے اور بہتر طور پر چلانے اور نبھانے کے زیادہ اہل ہیں۔ اور کچھ یہ سمجھتے تھے کہ قصی نے اپنی زندگی میں جو تقسیم کر دی تھی اس سے انحراف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔[20]

بنی عبد مناف نے حسب روایت خوشبو سے بھرا ہوا ایک پیالا لا کر اس میں اپنے ہاتھ ڈبوئے اور قسم کھائی کہ جب تک سمندر کے پانی میں اپنی گھاس کو تر رکھنے کی صلاحیت باقی ہے اپنے رفقاء کو نہ رسوا ہونے دیں گے اور نہ ہی سپردگی دیں گے۔ اسے معاہدہ مُطَیَّبِین (خوشبو لگانے والوں کا معاہدہ) کے نام سے موسوم کیا گیا۔

دوسری طرف فریق مخالف نے بھی اسی طرح کی قسم کھا کر آپس میں معاہدہ کر لیا۔ بجز اس کے کہ انہوں نے خوشبو سے ہاتھ تر نہ کئے تھے۔ اسے "معاہدۂ احلاف" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔[21]

آگے کی صورتحال پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ قیسی لکھتے ہیں:

ثم سلت السیوف واشرعت الاسنۃ وکادت الحرب ان تنشب فتاکل نارھا القوم. ولما ادرک الناعب مداہ مشی من ذوی المروءۃ بین الفریقین من سمعوا لہ فتداعوا الی الصلح ابقاء علی قریش. وھکذا حکموا بینھم من ارتضوا بحکمہ. فحکم بان یترکلبنی عبدالدار تراثھم من حجابۃ البیت والندوۃ وعقداللواء. یعود بنی عمھم بالسقایۃ ورفادۃ الحاج.[22]

پھر تلواریں سونت لی گئیں اور نیزے تول لئے گئے۔ اور قریب تھا کہ جنگ بھڑک اٹھتی اور اس کی آگ قوم قریش کو چاٹ جاتی۔ سب تیاریاں جب مکمل دیکھیں تو اس کی ہولناکیوں کا اندازہ کر کے طرفین میں سے کچھ جی دار لوگ اٹھے اور قریش کی بقاء کے عظیم تر مقصد کے تحت انہوں نے صلح کا داعیہ بیدار کیا۔ اس طرح سے انہوں نے فیصلے کیلئے اپنے باہم ایسے حَکَم کا انتخاب کیا جس کے حکم و فیصلے کو قبول کرنے پر سب رضامند تھے۔ اس نے فیصلہ دیا کہ بنی عبدالدار کے پاس حجابت البیت، ندوہ کی امارت اور جھنڈا باندھنے کا اختیار رہنے دیا جائے۔ جبکہ ان کے چچازاد یعنی بنی عبد مناف سقایہ اور رفادۃ الحاج (حاجیوں کی مہمان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

توازی) کے مناصب سنبھال لیں۔

اس طرح فریقین جب کسی قیمت پر پیچھے نہ ہٹنے کی قسمیں کھا کر میدان جنگ میں اتر آئے تھے اور جنگ کی ٹھان لی تھی تب بھی منصب حَکم نے ان کو تباہ کن جنگ کی ہولناکیوں سے بچا کر امن وآشتی کی راہ پر ڈال دیا اور اس موقع پر بھی حَکم کے فیصلے سے انحراف کی طرف کسی بھی فریق کا دھیان تک نہ گیا۔

حَکم کے فیصلے کی عظمت

حَکم کا فیصلہ مبنی برحق مانا جاتا تھا۔ عربوں کے نزدیک "حَکم" سچائی اور حقیقت حال کی دریافت کا سب سے بڑا اور معتبر ذریعہ تھا۔ حَکم، فریقین کے بیانات، دلائل وشواہد اور جملہ آثار وقرائن پہ گہرے غور وخوض کے بعد جو بھی فیصلہ صادر کر دیتا وہی ان کے نزدیک حق ہوتا اور سچ ہوتا تھا۔ اسی طرح حَکم کسی چیز کو جائز وناجائز یا حلال وحرام قرار دینے کا بھی مجاز تھا۔ بایں معنی یہی ان کا "شارع" تھا جس کے حکم سے سرمو انحراف کو روا نہیں رکھتے تھے۔ انکار یا فرار کے آثار دور دور تک ان کے وہم وخیال میں کہیں نہیں ملتے۔ اب یہ کیفیت تو پورے عرب میں پائی جاتی تھی کہ اپنے اپنے ہاں کے حَکم کے آگے سر تسلیم اور جبین نیاز خم رکھتے اور خود ان کے سردار اور والیان قوم، والیان کعبہ کو اپنا حَکم اعلیٰ مانتے اور ان کے آگے سرنگوں رہتے تھے۔ جیسا کہ اس امر کا اظہار زہیر بن ابی سلمیٰ مزنی کے اس شعر سے ہوتا ہے جو اس نے قریش مکہ کی مدح میں کہا۔ کہتا ہے:

متی یشتجر قوم تقل سرواتهم   هم بیننا، فهم رضاً وهم عدل [۴۳]

☆ جب کسی قوم میں اختلافات پھوٹ پڑتے ہیں تو ان کی سربرآوردہ شخصیات ایک ہی بات کرتی ہیں: وہ لوگ یعنی قریش، ہمارے درمیان حَکم ہیں۔ ان پہ سب راضی وخوش ہیں اور وہی عادل بھی ہیں۔

اب یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ قریش کی یہ عظمت اس وقت بھی قائم تھی جب ولایت کعبہ کے مناصب ووظائف قبیلہ قریش کی مختلف شاخوں میں بٹ جانے سے اصل الامر یعنی اقتدار اعلیٰ تقسیم در تقسیم کے عمل سے دوچار تھا۔ اور کسی ایک فرد کے تحکم وبالادستی قائم کرنے کی خواہش کو پورا کرنے کی راہ میں کمزور ہی سہی مگر کئی مزاحمتی وجود حائل ہو چکے تھے۔ جملہ اختیارات اگر کسی ایک ہی شخص کے پاس مرتکز ہو جاتے اور دیگر شخصی امتیازات اور انسانی خوبیوں وکمالات کا بھی وہ شخص حامل ہوتا تو اس کی ایک ایسی غیر معمولی حاکمیت اعلیٰ قائم ہو جاتی تھی کہ معاذ اللہ الوہیت کا گماں ہونے لگتا تھا۔

ہدایت ایزدی کے تحت یا خالص الہامی دین کے زیر اثر قائم ہونے والی حاکمیت اعلیٰ کا مزاج

بالکل جداگانہ نوعیت کا ہے۔ اس سے بیگانگی کے باعث روئے زمیں پر انسانی خدائی اور فرعونیت کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ پھر ایسے لوگوں کی ہر خواہش قطع نظر اس سے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز، موزوں ہے یا ناموزوں دین کے اساسی ضابطوں کی طرح معتبر اور مقتدر گنی اور مانی جاتی ہے۔ عربوں میں اصلاً یہی چیز پائی جاتی تھی۔ یہی چیز حکم جاہلیت کی اصل روح ہے۔ قرآن حکیم نے جاہلیت کے اسی حکم کا تذکرہ حسب ذیل آیت کریمہ میں کیا ہے:

افحکم الجاهلیة یبغون ومن احسن من الله حکما لقوم یوقنون [۴۴]

آیا یہ لوگ عہد جاہلیت کی طرز کے حکم وفیصلہ کے آرزومند ہیں اور یقین رکھنے والوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہو کون سکتا ہے۔

یہ جاہلیت ہی کا طرہ امتیاز ہے کہ عام افراد انسانی کو ایسے لامحدود اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے فرستادہ انبیاء کرام اور رسولان عظام ہی کے لئے اسلام نے مختص کر دیے ہیں۔ جاہلیت کی طرز زندگی کی یہی وہ ادا ہے جس کے باعث اہل اللہ نے ہر دور میں اسے للکارا ہے۔ بغیر کسی رکاوٹ وبندش کے لامتناہی اختیارات صرف ذات تعالیٰ ہی کو سزاوار ہیں۔ اس کے برعکس جاہلی فکر کا کارنامہ ملاحظہ کیجئے۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں قصی کے بارے میں لکھا ہے کہ اپنے عہد میں وہ عربوں کا "رب الحکم" ہو گیا تھا۔ [۴۵]

اسی طرح علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں:

قریش، قصی اور اس کے حکم کو باعث خیر وبرکت جانتے تھے چنانچہ جب کسی مرد وعورت کا نکاح ہوتا تو قصی کے گھر میں ہوتا، کسی بھی اہم معاملے کا فیصلہ کرنے کیلئے مشورہ کرنا ہوتا تو اسی کے گھر میں، کسی جنگ کیلئے جھنڈا باندھنا ہوتا تو وہ بھی اسی کے گھر میں اس کا کوئی بیٹا باندھتا تھا۔ سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد لڑکیوں کو اوڑھنی اسی کے گھر میں دی جاتی تھی۔ قصی کی زندگی میں اور اس کے مرنے کے بعد بھی قصی کا حکم "دین متبع" یعنی لائق اتباع دین کا درجہ رکھتا تھا۔ [۴۶]

علامہ طبری لکھتے ہیں:

فکان امره فی قومه من قریش فی حیاته وبعد موته کالدین المتبع، لا یعمل بغیره تیمنا بامره ومعرفة بفضله وشرفه۔ [۴۷]

© rasailojaraid.com